عائلی قوانین

(MUSLIM FAMILY LAWS)

۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین کا آرڈی ننس جاری ہوا۔ اس کے اجراء کے .... ساتھ ہی قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس طرح مخالفت کا طوفان برپا کر دیا گیا گویا اس سے اسلام کی پوری کی پوری عمارت منہدم ہو جائے گی۔ اس کے بعد موقعہ بے موقعہ، ان قوانین کے خلاف ہلّہ بولا جاتا رہا لیکن حکومت کے عزم اور استقامت نے اس سیلاب کو روکے رکھا۔ حتیٰ کہ ہماری نیشنل اسمبلی کے پہلے سیشن (منعقدہ جون۔ جولائی ۱۹۶۲ء) میں انہیں منسوخ کرنے کی ایک تحریک بھی پیش کر دی گئی، لیکن یہ سخت جان اس کی زد سے بھی بچ نکلا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اس آرڈی ننس کو تحفظ دے دیا گیا (کہ ان قوانین کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا) تو قدرے اطمینان ہوا۔ لیکن اب کچھ دنوں سے پھر مخالفت کے بحرِ خاموش میں ہلکورے اٹھ رہے ہیں اور ہر قلب حساس یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا

کبھی اخبارات میں یہ خبر شائع ہو جاتی ہے کہ ان قوانین کو منسوخ کیا جا رہا ہے۔ پھر اسی خبر کی تردید ہو جاتی ہے۔ چند دنوں کے بعد پھر تنسیخی کی خبر کا اعادہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اواخر اکتوبر میں اسلام آباد میں منعقدہ خواتین کانفرنس میں ایک ریزولیوشن پاس ہوا جس میں کہا گیا ہے کہ، ان قوانین کو منسوخ نہ کیا جائے۔ معلوم نہیں کہ جب یہ پرچہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا تو آخری خبر کیا ہو گی!

اس مدّ وجزر (جوار بھاٹا) سے فضا کا مرتعش ہو جانا لازمی تھا۔ چنانچہ ہمیں استفسارات موصول ہو رہے ہیں (بالخصوص نوجوان طبقہ کی طرف سے) کہ یہ قوانین کیا ہیں اور ان میں وہ کون سا خطرہ پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے ان کے خلاف مخالفت کا طوفان بیس سال سے جاری ہے۔

یہ سوالات طلوعِ اسلام سے کیوں کئے جا رہے ہیں، اور اس کا ان کے ساتھ کیا تعلق ہے ـــــ یہ داستان دلچسپ ہے۔ طلوعِ اسلام کا مشن قرآنی تعلیمات کا عام کرنا ہے۔ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کمزوروں۔

ضعیفوں۔ محتاجوں اور ناتوانوں کے حقوق کا تحفظ ہے۔ اور طلوعِ اسلام علیٰ قدرِ وسعت، اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں مصروف چلا آرہا ہے۔ ہماری قوم میں سب سے زیادہ مظلوم طبقہ عورتوں کا ہے، اور طلوعِ اسلام شروع سے یہ کوشش کرتا چلا آرہا ہے کہ انہیں وہ حقوق حاصل ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے تھے لیکن خود اپنوں کی دستبرد نے جنہیں صدیوں سے غصب کر رکھا ہے۔ عائلی قوانین ان حقوق کی بحالی کی طرف ایک خفیف سی پیش رفت تھی۔

مخالفت کے لئے دلائل کس قسم کے دیئے جاتے ہیں، یہ سننے کے قابل ہے:-

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے اُس زمانے کے صدر اور ممتاز عالم مولانا محمد داؤد غزنوی (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) نے کہیں کہہ دیا کہ یہ قوانین ایسے نہیں کہ تمام کے تمام مسترد کر دیئے جائیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جنہیں جزئی ترمیمات کے بعد قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس پر (سابقہ) جماعتِ اسلامی کے ترجمان 'ایشیا' نے اپنی ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ان پر بڑی لے دے کی اور لکھا کہ

مولانا جب یہ استدلال کر رہے ہیں تو ہم حیرت کے ساتھ سوچ رہے ہیں کہ ان کے قلم سے، مولانا محمد داؤد غزنوی، امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث بول رہے ہیں یا منکرینِ سنّت کے سرخیل غلام احمد پرویز۔ حکومت کے سربراہ اور امیرِ مملکت کو ———— وہ کسے با سند ———— حضرت عمرؓ کے مقام پر رکھ کر شریعتِ اسلامی کی تعبیر کرنے کا حق دینا، وہ ضال اور مضل نظریہ ہے جس نے عہدِ حاضر میں اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے اور جس کی آڑ لے کر آج اسلام کا حلیہ، ترکی۔ مصر۔ انڈونیشیا۔ تیونس اور دوسرے ممالک میں بگاڑا جا رہا ہے۔ اور پاکستان میں بھی اس کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ اس نظریہ کے حق میں منکرینِ سنت بالکل وہی دلیل دیتے ہیں جو اہلِ حدیث مولانا غزنوی نے پیش فرمائی ہے۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت اکتوبر ۱۹۶۳ء)

یعنی دلیل یہ نہیں کہ یہ قوانین کس طرح اسلام کے خلاف ہیں؟ دلیل یہ ہے کہ "غلام احمد پرویز" نے ان کی تائید کیوں کی ہے؟ اور ان کا یہ جرم اس قدر سنگین ہے کہ اگر ایک جید اہلِ حدیث عالم بھی ان سے متفق ہے تو اُسے بھی بخشا نہیں جا سکتا!

جب (۶۲-۱۹۶۱ء میں) ان قوانین کے خلاف پہلے پہل شورش برپا ہوئی تو طلوعِ اسلام نے (اپنی اگست ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں) ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں ان قوانین کا تجزیہ کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ یہ کس حد تک قرآنِ کریم کی منشاء کے مطابق ہیں اور ان میں کہاں تک ترمیم و اصلاح کی گنجائش ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حالیہ استفسارات کے جواب میں اگر اس مقالہ کو (ردّ و بدلِ تغیّر) شائع کر دیا جائے تو اس سے معاملہ کی وضاحت ہو جائے گی۔ لیکن اس مقالہ کے درج کرنے سے پہلے، ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مختصر الفاظ میں یہ بتا دیا جائے کہ وہ "قوانینِ شریعت" کس قسم کے تھے جن کا اطلاق عورتوں پر ہوتا تھا اور جن میں قدرے اصلاح کے لئے عائلی قوانین نافذ کئے گئے تھے۔ ان قوانین کی رو سے:-

۱۔ نابالغ لڑکی کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اور صرف نکاح ہی نہیں، اس سے جنسی اختلاط بھی جائز ہے "نابالغ لڑکی سے جنسی اختلاط!"
نکاح، ولی کی اجازت سے کیا جا سکتا ہے۔ (بلکہ ولی کی اجازت ضروری ہے)۔

۲۔ مرد جب چاہے، چار عورتوں تک سے شادی کر سکتا ہے۔ پہلی بیوی یا بیویاں اس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتیں۔ ان میں سے وہ جب جی چاہے کسی بیوی کو طلاق دے کر، اس کی جگہ نئی بیوی لا سکتا ہے۔

۳۔ مرد جب جی چاہے "طلاق۔ طلاق۔ طلاق" کہہ کر بیوی کو رخصت کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر (غصہ فرو ہو جانے پر) اسے اپنے کئے پر ندامت ہو، اور وہ اپنی (مطلقہ) بیوی سے از سرِ نو ازدواجی تعلقات وابستہ کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ (مظلومہ) خواہ ایک رات کے لئے کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔ اس کے ساتھ شب بسری کرے۔ دوسری صبح وہ مرد اسے طلاق دے دے۔ اس کے بعد یہ اپنے سابقہ شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ اسے حلالہ کہا جاتا ہے۔
بیوی اگر مستبد خاوند سے جان چھڑانا چاہے تو اسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا ہوگا۔

۴۔ یہ تو رہے وہ قوانین جن کا تعلق میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات سے ہے۔ ایک قانون ایسا بھی ہے جو وراثت سے متعلق ہے اور جس کی مخالفت سب سے زیادہ شدت سے ہوتی ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اگر کسی لڑکے کا باپ فوت ہو جائے اور وہ یتیم رہ جائے۔ اس کے بعد اس کا دادا مر جائے، تو اس دادا کی وراثت سے اس یتیم بچے کو کچھ نہیں مل سکتا۔ سارے کا سارا ترکہ اس کا چچا لے جائے گا۔

یہ تھے وہ قوانین جن میں اصلاح کی خاطر عائلی قوانین نافذ کئے گئے تھے۔ ہمارا مذہب پرست طبقہ ان (عائلی قوانین کو) منسوخ کر کے، پھر سے مذکورہ بالا قوانین نافذ کرانا چاہتا ہے۔

(۰)

اس تمہید کے بعد وہ مقالہ دیکھئے جو طلوعِ اسلام میں (سنہ ۱۹۶۳ء میں) شائع ہوا تھا۔ اس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ زیرِ نظر معاملہ کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں اور اس کے بعد، اس سے متعلق سنہ ۱۹۶۱ء کا نافذ کردہ عائلی قانون درج کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ قانون قرآنِ مجید کے خلاف ہے یا اس کے مطابق۔

عائلی قوانین مجریہ سنہ ۱۹۶۱ء

(قرآنِ کریم کی روشنی میں)

۱۔ نکاح:۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، ایک مرد اور عورت کا، ان تمام ذمہ داریوں اور حقوق کو لئے ہوئے

جو اللہ تعالےٰ نے اس باب میں متعین کئے ہیں، میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا معاہدہ "نکاح" کہلاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے مِيثَاقًا غَلِيظًا (۴/۲۱) "پختہ عہد" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ معاہدہ کسی خاص مدت کے لئے (وقتی) نہیں ہوتا بلکہ جب تک اسے اُس طریق کے مطابق جو قرآنِ مجید نے مقرر کیا ہے، (یعنی طلاق) فسخ نہ کیا جائے، قائم رہتا ہے۔

اس معاہدہ کی شرائط

معاہدہ کوئی بھی ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ فریقین بالغ ہوں اور وہ معاہدہ ان کی باہمی رضامندی سے بلا کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ قرآنِ کریم نے معاہدۂ نکاح کے لئے، ان دونوں شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس نے بلوغت کے لئے "نکاح کی عمر" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

بلوغت

سورۂ نساء میں ہے:۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ (۴/۶)

(تم جب یتیموں کے سرپرست بنو تو) انہیں پرکھتے رہو تاآنکہ وہ "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال و متاع ان کے حوالے کر دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ جب یتیم "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ اور سورۂ انعام میں ہے: حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (۶/۱۵۲) جب وہ "جوانی کی عمر" تک پہنچ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "نکاح کی عمر" جوانی ہے۔ جب تک لڑکا اور لڑکی جوان نہ ہو جائیں، وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچتے۔ لہٰذا، قرآن کی رُو سے نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچا۔ بلوغت کی عمر کا تعین، ہر ملک کے حالات کے مطابق، اسلامی حکومت خود کرے گی۔ قرآن نے اسی لئے اسے غیر معین رکھا ہے۔

یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی، تو یہ غلط ہے، نکاح کے وقت ان کی عمر سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔

(ب) نکاح کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے:۔

فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ (۴/۳)

تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں۔

اور عورتوں کے متعلق کہا کہ

لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا (۴/۱۹)

تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ ایسا کرنا حلال ہی نہیں۔

لہٰذا جس نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی شامل نہیں، وہ نکاح، قرآن کی رُو سے نکاح ہی نہیں

کہلا سکتا۔

چونکہ کم سنی میں نکاح ہو نہیں سکتا، اس لئے نکاح کے لئے ولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالغ لڑکی کا کوئی ولی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے معاملات کی خود مختار ہوتی ہے۔ مشورہ کی بات اور ہے۔

۲۔ نکاح سے مقصد

(ا) نکاح سے مقصد محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کا پورا کرنا ہے جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے "نکاح" کرتا ہے، اور ان ذمہ داریوں کی پرواہ نہیں کرتا جو نکاح کی رُو سے عائد ہوتی ہیں، تو قرآن کریم کی رُو سے وہ حقیقی معنوں میں نکاح نہیں ہوتا۔ اس لئے، اس کی وضاحت: مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ ط (۴/۲۴) کہہ کر کر دی ہے ——— "مُحْصِنِيْنَ" کے معنی ہیں، حدود و قیود کے اندر رہنے کے لئے۔ اور "مُسَافِحِيْنَ" سے مراد ہے محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے۔

حقوق و فرائض

(ب) نکاح سے، مرد اور عورت دونوں پر یکساں حقوق اور یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ط[1] (۲/۲۲۸) "قاعدے اور قانون کے مطابق، عورت کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں، جتنی اس کی ذمہ داریاں ہیں۔"

(ج) میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہونے چاہئیں کہ اس سے گھر میں سکون اور اطمینان پیدا ہو۔ قرآن کریم کی رُو سے "ازواج" (جوڑوں) کا مطلب ہی یہ ہے کہ لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا۔ (۳۰/۲۱) ان سے تسکین حاصل ہو، اور باہمی محبت اور رفاقت پیدا ہو۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (۳۰/۲۱) ایسے گھر کو خدا، جنت سے تعبیر کرتا ہے۔ (۲/۲۲۱) اس کے برعکس، جس میاں بیوی میں، ہم آہنگی خیالات نہ ہوں، ان کے گھر کو وہ جہنم کہہ کر پکارتا ہے۔ (۲/۲۲۱)

عائلی قوانین

عائلی قوانین کی رُو سے، نابالغ لڑکی یا لڑکے کے نکاح کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے اور یہ قرآن کی منشاء کے مطابق ہے۔ علماء حضرات اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

(د) رجسٹریشن

چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اسے ضبطِ تحریر میں لے آنا، اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرا دینا ہی بہتر ہے۔ اس سے مستقبل میں پیدا ہونے والے بہت سے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے

ط۱ اس آیت میں جو ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ تو اس کا مفہوم "طلاق اور عدت" کے عنوان میں بیان کیا جائے گا۔

تو باہمی لین دین کے معاملات کو بھی تحریر میں لانے کی سخت تاکید کی ہے (۲/۲۸۲) - نکاح کا معاہدہ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

عائلی قوانین میں، اس معاہدہ کو سرکاری رجسٹر میں درج کرانے کی تاکید کی گئی ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کونسی بات خلافِ شریعت ہے۔

۲- مہر

(ا) چونکہ ازدواجی میزان میں، عورت کا پلڑا، بمقابلہ مرد کے، جھکتا ہے (یعنی عورت کی قدر و قیمت مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہے) اس لئے، مرد کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ کچھ تحفہ عورت کو دے۔ اسے مہر کہا جاتا ہے۔ یہ مہر کسی بات کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر، بطور تحفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے نِحۡلَۃً کا لفظ استعمال کیا ہے (۴/۴) جس کے معنی ہیں "بلا بدل"۔

(ب) قرآن نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی جو کچھ بھی باہمی رضامندی سے طے ہو جائے وہ مہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے، اس لئے اسے علیٰ قدرِ وسعت ہونا چاہیئے۔ (دیکھئے ۲/۲۳۶ ؛ ۴/۲۰)

(ج) مہر، عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اُسے اس سے محروم کر دے۔ البتہ عورت اپنی رضامندی سے اس میں سے کچھ چھوڑ بھی سکتی ہے۔ (۴/۴)

(د) اگر کسی وجہ سے مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اسے مرد کی وسعت کے مطابق طے کر لینا چاہیئے (۲/۲۳۶)

عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ اگر شادی معاہدہ مہر کی ادائیگی کے طریق کار کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہ ہو تو مہر کی کل رقم کے متعلق یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ عند الطلب واجب الادا ہے۔ قرآنِ کریم میں مؤجل اور معجّل کی کوئی تفریق نہیں۔

۳- طلاق

(ا) طلاق کے معنی ہیں "نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا"۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد اور عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا اس لئے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ، جب جی چاہے، اپنی مرضی سے، اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مراد وہ نظام ہے جو متنازعہ فیہ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے اسلامی مملکت کی طرف سے قائم ہو۔ اسے عدالت کہا جائے گا)۔ چنانچہ اس باب میں، سورۃ النسآء میں ہے:-

اگر تم کسی میاں بیوی میں، باہمی اختلاف۔ جھگڑے یا مخالفت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو،

تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ، جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ میاں بیوی میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ (۴/۳۵)

(۲) اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو ہو المراد ——— لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس عدالت کے پاس بھیجنی ہوگی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہیئے۔ اور اس کی شرائط کیا ہوں گی۔ عدالت کے اس فیصلے کا نام ' طلاق ہوگا۔ واضح رہے کہ اگر میاں یا بیوی میں سے کوئی ایک بھی مصالحت سے انکار کرے تو عدالت کے لئے طلاق کا حکم نافذ کرنا ضروری ہوگا ——— انہیں زبردستی نکاح میں باندھے نہیں رکھا جا سکتا۔

طلاق کے بارے میں عائلی قوانین میں جو طریق کار تجویز کیا گیا ہے وہ قرآن کی منشا کے مطابق ہے لیکن اس میں دو ایک نقص ہیں، جن کا دور کیا جانا ضروری ہے۔

(i) اس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے وہ طلاق کا اعلان کرنے کے فوراً بعد اس امر کی اطلاع (نوٹس) یونین کے چیئرمین کو دے۔

(ii) چیئرمین ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا تاکہ فریقین میں مصالحت کرائی جائے۔

اگر مصالحت نہ ہو سکے تو، نوٹس کی تاریخ سے نوّے دن کے بعد، طلاق مؤثر ہو جائے گی۔

یعنی معاہدہ نکاح منسوخ تصوّر ہوگا۔

شق (i) میں نقص یہ ہے کہ

(i) اس میں مرد کو حق دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے، طلاق کا اعلان کر دے۔ یہ خلاف قرآن ہے۔ اس شق کو یوں تبدیل کر دینا چاہیئے کہ

جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ وہ اپنے اس اراد کی اطلاع چیئرمین کو دے۔

اس صورت میں مصالحت کے کچھ معنی بھی ہوں گے۔ ورنہ طلاق کا اعلان کر دینے کے بعد، ثالثی بورڈ کا تقرر اور مصالحت کی کوشش، بے معنی ہے۔

(ب) دوسرا نقص یہ ہے کہ اس میں طلاق کے اعلان کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔ عورت کو نہیں۔ عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اگر طلاق کا حق باضابطہ طور پر بیوی کو دیا گیا ہے تو وہ طلاق کا اعلان کرکے ثالثی کونسل کی طرف رجوع کر سکتی ہے۔

"بیوی کو طلاق کا حق باضابطہ طور پر دینے" کا مطلب کچھ نہیں۔ معاہدہ نکاح کی رو سے، میاں اور بیوی دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے جن حالات میں، مرد، طلاق حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ انہی حالات

میں عورت بھی ویسا ہی حق رکھتی ہے۔ یہ بات تو بڑی تعجب انگیز سی ہوگی کہ معاہدہ تو فریقین کی رضامندی سے ہو اور اس کے فسخ کرنے یا کرانے کا حق صرف ایک فریق کو حاصل ہو، دوسرے کو حاصل نہ ہو!

عائلی قوانین کی رُو سے، اگر بیوی کو، "باضابطہ طلاق کا حق" نہ دیا گیا ہو، تو اسے تنسیخِ نکاح کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کرنا پڑتا ہے۔ میاں اور بیوی کے لئے، الگ الگ قوانین، قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

لہٰذا اس شق کا اطلاق میاں اور بیوی دونوں پر یکساں ہونا چاہیئے۔ یہ ترمیم نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر مرد کو یہ حق ہر وقت رہتا ہے کہ وہ جب جی چاہے طلاق کا اعلان کر دے۔ اس کے بعد ثالثی کونسل میں جا کر کہہ دے کہ میں مصالحت کرنے پر تیار نہیں۔ ثالثی کونسل اس میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ مرد طلاق دے چکا۔ وہ طلاق مؤثر ہو گی۔ یہ وہی ظلم ہے جو مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس قانون نے اس ظلم میں کسی قسم کی کمی یا اصلاح نہیں کی۔ لہٰذا، اس شق کی صورت یوں ہونی چاہیئے کہ

میاں یا بیوی میں سے جو کوئی، معاہدۂ نکاح کو فسخ کرنے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ اس امر کی اطلاع چیئرمین کو دے۔ ....

شق (۷)

میں کہا گیا ہے کہ اگر مصالحت نہ ہو سکے تو نوٹس کی تاریخ کے نوّے دن بعد، طلاق مؤثر سمجھی جائیگی۔ (نوّے دن بطور عدّت رکھے گئے ہیں)۔

قرآنِ کریم کی رُو سے

(ا) طلاق اس دن ہو گی جب عدالت فیصلہ کرے کہ فریقین کا معاہدۂ نکاح فسخ کیا جاتا ہے۔ عدّت بھی اُسی وقت سے شروع ہو گی۔

(ب) عدّت کی مدّت، مختلف حالات میں مختلف ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ تفصیلی طور پر مذکور ہے۔ وہی مدت ہمارے قانون میں درج ہونی چاہیئے۔ موجودہ شق ناقص ہے۔

نوٹ:۔ ان تمام معاملات میں، عائلی قوانین کی رُو سے، یونین کونسل اور اس کے چیئرمین کو مجاز قرار دیا گیا ہے، ہماری رائے میں اس کی جگہ کسی باقاعدہ عدالت کو یہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔[1]

طلاق کے متعلق اس پوری کی پوری شق کی سخت مخالفت ہوئی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ

(۱) مرد کو حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے۔ طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر بیوی کو گھر سے نکال دے۔ عورت کو ایسا حق حاصل نہیں۔

---

[1] یونین کونسلوں کے ختم ہو جانے کے بعد، اس کے لئے فیملی کورٹ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ (سنہ ۱۹۸۰ء)

(۲) اگر عورت گلو خلاصی کرانا چاہے تو اسے عدالت کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اسے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ واقعی علیحدگی کی مستحق ہے۔ اسے طلاق نہیں بلکہ خلع کہا جاتا ہے جس کے لئے عورت کو "حق مہر" چھوڑنا پڑتا ہے۔

(۳) یہ بات مرد کے دائرۂ اختیار میں ہے کہ وہ عورت کو طلاق کا حق تفویض کرے یا نہ کرے۔

۴۔ طلاق کے بعد

(ا) عدالت کے فیصلہ سے نکاح منسوخ ہوگیا۔ اس کے بعد، عدت کے دوران، یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔ لیکن اگر یہ (سابقہ) میاں بیوی چاہیں آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔

(ب) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، عدت کے دوران یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن مرد پر اس کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ جب چاہے، کسی دوسری عورت سے شادی کر سکتا ہے، بس یہ ایک "زائد حق" ہے جو عورت کے مقابلہ میں مرد کو حاصل ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸) میں اسی زائد حق کی طرف اشارہ ہے۔

(ج) اگر یہ سابقہ میاں بیوی چاہیں تو عدت کی مدت کے بعد بھی آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے (عدت کے دوران یا اس کے بعد) آپس میں شادی کر لی لیکن اس کے بعد پھر، مذکورہ بالا طریق کے مطابق، ان میں طلاق ہوگئی، تو دوسری مرتبہ بھی یہ میاں بیوی، عدت کے دوران یا عدت کے بعد، آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ (یہ دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد کی، شادی ہوگی)۔

لیکن اگر ان میں پھر طلاق کی نوبت آجائے (یعنی تیسری مرتبہ طلاق ہو جائے) تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کر سکتے، نہ عدت کے دوران، نہ اس کے بعد۔ قرآن میں ہے، اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹)۔ "طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم، قاعدے کے مطابق، عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو یا حسن کارانہ انداز سے رخصت کر سکتے ہو" لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد تم آپس میں نکاح نہیں کر سکتے، یہ مطلب ہے "تین طلاق" سے۔

عائلی قوانین

میں یہ شق قرآن کریم کی منشاء کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ذیل کے اضافے کی ضرورت ہے۔ یعنی

(د) تیسری طلاق کے بعد اگر اس عورت کو نئے خاوند سے طلاق مل جائے۔ یا وہ فوت ہو جائے، تو پھر یہ عورت، اگر چاہے، تو اپنے سابقہ خاوند سے شادی کر سکتی ہے۔ (۲/۲۳۰)

مولوی صاحبان اس شق کے بھی سخت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے "تین دفعہ (طلاق - طلاق - طلاق) کہہ دے۔ اس کے بعد وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔ الا

کے پھر سے حلال ہونے کی ایک ہی شکل ہے کہ یہ عورت (خواہ ایک رات کے لئے) کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرے۔ اس کے ساتھ شب بسری کرے۔ دوسری صبح وہ مرد اسے طلاق دے دے۔ اس کے بعد یہ اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ اس طریق کو حلالہ کہتے ہیں۔

——— (۰) ———

۵۔ تعددِ ازدواج (ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح)

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، نکاح سے مقصد یہ ہے کہ انسان امن و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کا تعلق ہو جس سے گھر "جنت" بن جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے تاکید کی ہے کہ بیوی (یا میاں) کے انتخاب میں خیالات اور نظریات کی موافقت کا خیال رکھا جائے۔ نکاح فریقین کی رضامندی سے، بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ اس قدر احتیاط کے باوجود، اگر تجربہ بتائے کہ انتخاب صحیح نہیں تھا اور اس رشتے کا نباہ مشکل ہے، تو نکاح کا معاہدہ فسخ کر لیا جائے، اور بیشک کسی دوسری عورت (یا مرد) سے شادی کر لی جائے۔ سورۂ نساء میں ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ...... (۴/۲۰) "اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو (تو اس طریق کے مطابق جس کا ذکر طلاق کے عنوان میں کیا جا چکا ہے) پہلی بیوی سے، معاہدۂ نکاح فسخ کر لو، اور پھر دوسری عورت سے شادی کرو۔" اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، شادی کا اصول "ایک وقت میں ایک بیوی" (MONOGAMY) ہے۔

ہنگامی حالات

(۲) لیکن قرآنِ کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کے پیشِ نظر، اس اصولی قانون میں، استثناء کی ضرورت لاحق ہو جائے۔ اس قسم کے حالات، اسلام کے ابتدائی دور میں مدینہ کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ

(۱) مسلمانوں کی ایک محدود سی جماعت تھی (جنگِ بدر میں، جو ۲ھ میں ہوئی تھی، مسلمان مجاہدین کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی)۔

(۲) مسلسل لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو رسول اللہ کی پوری مدنی زندگی میں جاری رہا۔

(۳) ان لڑائیوں کی وجہ سے، اس مختصر سی جماعت میں نوجوان افراد کی کمی ہوتی چلی گئی اور بیوائیں اور یتیم بچے دن بدن زیادہ ہوتے گئے۔ ان کے علاوہ مسلمان عورتیں، مکہ میں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف آنا شروع ہو گئیں۔

(۴) مسلمان عورتیں، صرف مسلمان مردوں سے شادی کر سکتی تھیں۔ کسی غیر مسلم سے نہیں کر سکتی تھیں۔ حتیٰ کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے بھی نہیں۔

(۵) لہٰذا، اس وقت صورت یہ پیدا ہو گئی کہ بیواؤں کی، اور شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، مردوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو گئی۔ بیواؤں کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم اور لاوارث رہ گئے۔

(۶) ان ہنگامی حالات میں، اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ "ایک بیوی" کے اصولی قانون میں استثناء (EXCEPTION) کر دی جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، قرآن نے کہا کہ

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً ..... (۴/۳)

اس آیت کے تین حصے ہیں اور تینوں کا ترجمہ اور مفہوم حسبِ ذیل ہے:-

(۱) وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ ....

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے..... تو

عربی زبان میں "یتامیٰ" یتیم بچوں کو بھی کہتے ہیں اور ان عورتوں کو بھی جن کے شوہر نہ ہوں۔ (خود قرآنِ کریم میں یتامی النساء انہی معنوں میں آیا ہے۔ ۴/۱۲۷) لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جس میں تم دیکھو کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور بے شوہر کی عورتیں زیادہ ہو گئی ہیں، اور ایک مرد ایک عورت کے اصول کے مطابق، ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو کیا کرو۔

(۲) فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ

ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو۔ دو، دو۔ تین، تین۔ چار، چار تک۔

یعنی ایسی صورت میں "ایک بیوی" کے اصول میں استثناء کر لو اور ان بے شوہر عورتوں کو اپنے خاندان کا جزو بنا لو۔ جتنی ان کی تعداد ہو اس لحاظ سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لاوارث عورتیں اور ان کے بچے، مختلف خاندانوں میں جذب ہو جائیں۔ (یہ تدابیر اسلامی حکومت کی طرف سے طے ہوں گی)۔

(۳) فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً ۔

لیکن اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے، تو پھر وہی "ایک بیوی" کا اصول برقرار رہے گا۔

بات بالکل صاف ہے۔ "عدل" کے متعلق قرآنِ کریم نے آگے چل کر کہہ دیا کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، ان میں یکسانیت کا سلوک تو ناممکن ہے اس لئے تم اتنی احتیاط رکھو کہ کسی ایک کی طرف اتنا نہ جھک جاؤ کہ دوسری ادھر لٹکی رہ جائے۔ (۴/۱۲۹) ــــــ کہاں وہ بیوی جو تمہاری عمر بھر کی رفیقہ ہے۔ جس کی وجہ سے گھر جنت کا نمونہ بن رہا ہے۔ اور کہاں یہ، جسے تم معاشرہ کی ایک اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جزوِ خاندان بنا رہے ہو۔ تمہارے جذبات دونوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس سے یہ نہ ہو کہ یہ نو آمدہ ــــــ جو بے چاری پہلے ہی مصیبت زدہ۔ بے کس اور لاوارث ہے ــــــ نہ ادھر کی رہے نہ اُدھر کی۔

پہلی بیوی کی رضامندی

یہ بھی ظاہر ہے کہ ان حالات میں بھی دوسری بیوی لانے کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہوگی اس لئے کہ

(i) قرآن کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے کہ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کے تعلقات ہوں اور گھر میں سکون و اطمینان رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دوسری شادی، پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے، تو پہلی بیوی کے ساتھ محبت اور موانست کیسے رہ سکے گی اور گھر میں سکون و اطمینان کہاں باقی رہے گا؟ ایسا ہونا ناممکن ہے! اس لئے پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر دوسری بیوی لائی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآن کا یہ منشاء نہیں کہ کسی اُجڑے ہوئے کنبہ کو آباد کرنے کے لئے، اپنے بستے رستے گھر کو ویران کر دیا جائے۔

(ii) قرآن کریم نے دوسری شادی کے لئے عدل کی شرط عائد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پہلی بیوی، دوسری شادی کی مخالفت کر رہی ہو، اور اس کی مخالفت کے علی الرغم دوسری بیوی گھر میں آجائے، تو پہلی بیوی سے عدل کس طرح ہو سکے گا؟

(iii) قرآن کریم نے کہا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناچاقی ہو جائے تو ایک ثالثی بورڈ قائم کرو تا کہ ان دونوں میں مصالحت کرا دی جائے۔ اگر ان میں مصالحت نہ ہو سکے تو پھر نکاح فسخ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسری شادی، پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے گی، تو (پہلے) میاں بیوی میں ناچاقی اُسی وقت شروع ہو جائے گی، اور اس ناچاقی کی وجہ وہ ہوگی (یعنی دوسری بیوی) جس کی موجودگی میں مصالحت کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی صورت یہی ہوگی کہ یا پہلی بیوی کو (ناحق) طلاق دے دی جائے، یا دوسری بیوی کو چھوڑ دیا جائے۔

یہ چیز کہ دوسری شادی کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے، خود نبی اکرمؐ کے ایک ذاتی فیصلہ سے بھی ثابت ہے۔

> ایک دفعہ حضرت علیؓ نے دوسرا نکاح کرنا چاہا۔ آنحضرت (صلعم) کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ آپؐ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ اس میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ فرمایا "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے۔ جس سے اُسے دکھ پہنچے گا، مجھے اذیت ہوگی"۔ چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادے سے باز آ گئے، اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک دوسرا نکاح نہ کیا۔
>
> (سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۶۲۷۔ بحوالہ بخاری)

ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ اپنی بیٹی کے متعلق فرمایا اس کا اطلاق اُمت کی ہر بیٹی پر ہوگا۔ اس لئے جس دوسرے نکاح سے پہلی بیوی کو دکھ پہنچے وہ رسول اللہ کے اس فیصلہ کے مطابق بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کہا جائے گا کہ پہلی بیوی، دوسری شادی کی اجازت کیسے دے گی! سو پہلی بات تو یہ ہے کہ جن حالات کے پیش نظر قرآن نے دوسری شادی کی اجازت دی ہے، ان میں مومن عورتیں اپنی خانماں برباد، لاوارث، بےکس بہنوں کی امداد کے لئے یقیناً آگے بڑھ آئی ہوں گی (اور انہی جیسے حالات میں

ہیں مومن عورتوں سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں گی)۔ علاوہ ازیں دوسری بیوی بھی، پہلی بیوی کے سر پر سوار ہونے کا جذبہ لے کر نہیں آئے گی۔ وہ اس کی ممنون احسان ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود، اگر پہلی بیوی کسی وجہ سے، دوسری شادی کے حق میں نہیں، تو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہوسکتی۔

بے شوہر کی عورتوں کا منصفانہ حل اسی صورت میں مل سکتا ہے جب وہ اس طرح جزو خاندان بنائی جائیں کہ گھروں کا امن و سکون قائم رہے اور پہلے میاں بیوی میں محبت اور رفاقت کا تعلق بدستور باقی رہے۔ اگر اس سے گھر جہنم بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ایک مشکل کا حل تلاش کرتے کرتے دس مشکلات اور پیدا کرلیں[1]۔

دوسری شادی کے لئے، قرآن کریم میں صرف یہی ایک آیت ہے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوسری شادی کے لئے تین شرطیں ضروری ہیں۔

اوّل - بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے مسئلہ کی موجودگی۔

دوم - پہلی بیوی کی رضامندی۔ اور

سوم - عدل۔

حضورؐ کا اسوۂ حسنہ

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی موجود نہیں تو قرآن کی رُو سے دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ نہ ہی مقصد اوّل کے سوا کسی اور مقصد کے لئے دوسری شادی کی اجازت ہے۔ خود نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

(۱) حضورؐ نے پچیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ساری جوانی سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ رہی۔

(۲) پچیس سال کی عمر میں ایک صاحب اولاد بیوہ سے شادی کی جن کی عمر اس وقت چالیس سال کی تھی۔

(۳) جب تک وہ بیوی (حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ) زندہ رہیں حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی، حالانکہ ان کی عمر وفات کے وقت قریب پینسٹھ سال سے بھی زیادہ تھی۔ یعنی بیوی کی اس قدر عمر رسیدگی کے باوجود، دوسری شادی کا خیال تک نہیں کیا۔ (واضح رہے کہ اس وقت حضورؐ کی نرینہ اولاد بھی کوئی نہیں تھی ——— جو لڑکے پیدا ہوئے تھے وہ وفات پاچکے تھے)۔

(۴) حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد صرف ایک شادی ہے جو حضورؐ نے غیر شادی شدہ عورت (حضرت عائشہؓ) سے کی۔ (اور وہ اس وقت جب ہنوز جنگوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا)۔ باقی

---

[1] اس مقالہ میں ازدواجی قوانین کے متعلق مختصر سی بحث کی گئی ہے۔ جو حضرات ان کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں وہ پرویز صاحب کی کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" کا مطالعہ فرمائیں۔ (سنہ ۱۹۸۰ء)

تمام نکاح، ان ہنگامی حالات میں ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اور ان عورتوں سے جو (کئی کئی بار کی) بیوہ یا مطلقہ تھیں اور لاوارث و بے کس، بالعموم عمر رسیدہ۔ مقصد اس سے ان محتاجوں اور بے کسوں کی پناہ دہی تھی۔ چنانچہ باسورتھ سمتھ (BOSWORTH SMITH) اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

> محمدؐ کی شادیوں کی توجیہ جس طرح دیگر مقاصد کے تحت کی جا سکتی ہے، اسی طرح اس مقصد کے تحت بھی کہ اس سے کس مپرس، بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا مقصود تھا۔ یہ شادیاں ان عورتوں سے ہوئیں جو قریب قریب سب کی سب بیوہ تھیں اور نہ اپنے حسن و جمال اور نہ مال و دولت کی بنا پر کوئی شہرت رکھتی تھیں۔ بلکہ صورت حالات اس کے بالکل برعکس تھی۔ (MOHAMMAD & MOHAMMADANISM)

باقی رہا یہ کہ ان شادیوں میں، پہلی ازواج مطہراتؓ کی رضامندی شامل ہوتی تھی۔ سو اس کا ثبوت یہ ہے کہ روایات کی رو سے یہ (پہلی بیویاں) ہر نئی آنے والی بیوی کا خیر مقدم کرتی تھیں اور اسے مبارک باد دیتی تھیں۔ اگر یہ شادیاں ان کی مرضی کے خلاف ہوتیں تو وہ آنے والی کے استقبال اور مبارکباد کے لئے کبھی آگے نہ بڑھتیں*۔

عائلی قوانین

عائلی قوانین میں اگرچہ کہا گیا ہے کہ ثالثی کونسل کی منظوری کے بغیر دوسری شادی نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے لئے صرف پہلی بیوی کی رضامندی کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ قرآنی شرط (یعنی بے شوہر عورتوں وغیرہ کی کثرت کا) ذکر نہیں۔

لیکن ہمارے قدامت پسند طبقہ پر اتنی سی شرط بھی گراں گذر رہی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مرد کو بلا مشروط حق حاصل ہے کہ جب چاہے چار تک بیویاں کر لے۔ اس کے اس حق پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا "شریعت" کے خلاف ہے۔

چار بیویوں کے علاوہ وہ لونڈیاں رکھنے کا حق بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں (ایک صاحب نے اسمبلی میں اس کا مطالبہ بھی پیش کر دیا تھا۔ ۱۹۸۰ء)

———— (۰) ————

۶۔ وراثت عائلی قوانین میں ایک شق یہ بھی ہے کہ

---

* ہم نے اس جگہ اور دیگر مقامات پر حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ان روایات کو ہم اس لئے صحیح مانتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ یہی روایات کے صحیح یا غلط ہونے کا ہمارے نزدیک بنیادی معیار ہے۔

اگر وراثت کے شروع ہونے سے پہلے، مورث کے کسی لڑکے یا لڑکی کی موت واقع ہو جائے تو ایسے لڑکے یا لڑکی کے بچوں کو (اگر کوئی ہو) بحصہ رسدی وہی ملے گا جو اس لڑکے یا لڑکی کو (جیسی کہ صورت ہو) زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔

یہ بات حسبِ ذیل نقشہ سے سمجھ میں آسکے گی :-

زید

عمر (زید کا بیٹا) — بکر (زید کا بیٹا)

حامد (زید کا پوتا) — رشید (زید کا پوتا)

اگر زید کی زندگی میں بکر فوت ہو جائے تو رشید یتیم رہ جائے گا۔ اس کے بعد جب زید کی وفات ہو گی تو، حضرات علمائے کرام کے ارشاد کے مطابق، زید کی جائداد میں سے رشید (یتیم پوتے) کو کچھ نہیں ملے گا۔ ساری جائداد عمر کو مل جائے گی۔ رشید اپنے دادا کی جائداد سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ وہ بیچارا یتیم رہ گیا تھا!

عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ (یہ اس یتیم کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے)۔ زید کی وفات پر رشید کو وہی حصہ ملنا چاہیئے جو اس کے باپ کو ملتا۔ یہ قانون، قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔ اس سلسلہ میں ہم تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ہمارے مولوی صاحبان اس کے سخت مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زید کے ترکہ سے اس کے یتیم پوتے کو کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔ (خواتین کی حالیہ کانفرنس میں ایک (مرد) مقرر نے بھی یتیم پوتے کے حقِ وراثت کی مخالفت کی تھی —— انا للہ و انا الیہ راجعون —— "دی مسلم"۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۰ء)۔

(-)

یہ ہیں عائلی قوانین اور یہ ہے ان کی مخالفت کی تفصیل۔ اس مقام پر ہر صاحبِ عقل و بصیرت کے دل میں یہ خیال ابھرے گا کہ جب قوانین قرآن مجید کے بھی خلاف نہیں، اور فہم و تدبر کی رُو سے بھی معقول نظر آتے ہیں، تو پھر ان کی مخالفت کس بنا پر کی جاتی ہے؟ اس کے لئے آپ ایک بنیادی حقیقت کو سمجھ لیں گے تو نہ صرف زیرِ نظر مسئلہ، بلکہ مذہب کے جملہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ ہمارے علماء حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ فقہ کے قوانین (جو آج سے ہزار بارہ سو سال پہلے مرتب ہوئے تھے) ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ ہمیشہ قوانینِ شریعت کی حیثیت سے نافذ رہیں گے اور ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جب ان میں تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا تو پھر ان پر غور و خوض کرنے یا انہیں پرکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ان کا عقیدہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو بات کسی کے عقیدہ کے خلاف ہو، وہ اس سے متفق نہیں

ہو سکتا۔ یہ ہے بنیادی وجہ ان کی مخالفت کی۔ کسی عقیدہ کا تعلق اگر کسی کی پرائیویٹ زندگی تک محدود ہو تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر عقیدہ قانونِ شریعت کی حیثیت اختیار کر لے تو پوری کی پوری قوم اس سے متاثر ہو گی، اور ان میں، اور ان لوگوں میں جو اس عقیدہ میں ان سے متفق نہیں باہمی نزاع پیدا ہو گی۔ قوم میں جو اختلاف، افتراق، انتشار اور اس سے آگے بڑھ کر، تنازعات اور فسادات برپا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس سوال کا تعلق محض عائلی قوانین سے نہیں، یہ سوال ہماری زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں کو محیط ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ

حکمرانی کتاب اللہ کی ہو گی یا انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی؟

سوال جس قدر اہم ہے (بحالاتِ موجودہ) اسی قدر مشکل بھی ہے۔ اس کا صحیح جواب وہی دے سکے گا جو (اقبال رح کے الفاظ میں) روحِ عمر رض کو لے کر آگے بڑھے اور پورے عزم اور ہمت کے ساتھ کہے کہ

حسبنا کتاب اللہ

حکمرانی خدا کی کتاب کی ہو گی۔

(۰)

ایک ضروری وضاحت

اشاعت زیرِ نظر میں پرویز صاحب کا ایک مبسوط مقالہ بہ عنوان "کیا قائدِ اعظم رح پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟" شائع ہو رہا ہے۔ یہ مقالہ پہلے روزنامہ نوائے وقت کی ۱۷ راکتوبر کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ پرویز صاحب نے اس میں کچھ لفظی تغیرات اور چند ایک اضافے کئے ہیں جن سے یہ مقالہ، نوائے وقت میں شائع شدہ مقالہ سے قدرے مختلف ہو گیا ہے۔ بایں ہمہ ہم اسے نوائے وقت کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ اس مقالہ کا ایک الگ پمفلٹ بھی شائع کیا گیا ہے۔　(ناظم ادارہ)

بقیہ صفحہ ۸ سے آگے

بہاولپور میں (ریڈیو ٹیپ) ہر جمعہ
باہتمام ڈاکٹر (ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
۱- ۸ بجے صبح۔ عثمانی خیراتی شفاخانہ غنی پور
۲- ۳ بجے سہ پہر بعد نماز جمعہ بر مکان اعظم منزل۔ مچھلی بازار

کوئٹہ میں (ریڈیو ٹیپ) باقاعدگی سے ہفتہ وار د
رابطہ کے لئے:-
ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر توغی روڈ پر
محترم غلام صابر صاحب سے رجوع فرمائیں